 

13-08-2016

ہم بہ چشمِ غیر

مفتی منیب الرحمٰن

1969 میں، میں نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے کیا، تو بی۔اے کی انگلش کی کتاب میں ایک سبق کا عنوان تھا''How Others See Us'' یعنی دوسرے ہمیں کس نظر سے دیکھتے ہیں یا ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟، اسی کا ترجمہ میں نے ''ہم بہ چشمِ غیر'' کیا ہے اور اِسے کالم کا عنوان بنایا ہے۔اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنا Assessment اور درجہ بندی (Grading) خود کرتا ہے اور نہایت آسانی سے اپنے آپ کو اے ون گریڈ میں پاس کر لیتا ہے یا ٹاپ پوزیشن پر فرض کر لیتا ہے۔اس نفسیاتی سوچ نے ہمیں حقیقت پسندی سے دور کر دیا ہے، پس زیادہ تر ہم خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور گردوپیش کے حقائق سے صَرفِ نظر کر کے رائے قائم کرتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں اور اِقدام کرتے ہیں، مگر بعد میں پچھتاوے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔میں نے ون پلس فور قسم کے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنا چھوڑ دیے ہیں، کیونکہ ان پروگراموں نے لوگوں کو شعور نہیں دیا، نہ کبھی کسی مسئلے کا متفقہ حل پیش کیا ہے۔بس زبان درازی، ایک دوسرے کی تغلیط اور تحقیر وتوہین ہمارا مزاج بنتا جارہا ہے اور ہم ان مَظاہر کو دیکھ اور سُن کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان پروگراموں نے آگہی نہیں دی بلکہ جہالت میں اضافہ کیا ہے اور شعور کی حدوں میں داخل ہونے والی نئی نسل کے اَخلاق اور اندازِ گفتار و کردار کو بھی بگاڑ دیا ہے۔بظاہر ان سے نجات کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ کاروباری مفادات اور مُسابقت کا جذبہ ہر چیز پر حاوی ہوتا جارہا ہے۔

حال ہی میں دو پروگرام دیکھنے کو ملے ہیں، ایک تو افغانستان کے صدر ڈاکٹر اشرف غنی کا سلیم صافی صاحب کے ساتھ انٹرویو اور دوسرا واشنگٹن میں خارجہ امور کے ماہر اور Lobbyist (یعنی اپنی اسپانسر ریاستوں اور اداروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے بااثر حلقوں میں ذہن سازی کرنے والے) ہیں، اُن کا نام معید یوسف ہے۔نجم سیٹھی صاحب کے پروگرام ''آپس کی بات'' میں انہیں سننے کا موقع ملا۔ڈاکٹر اشرف غنی کا انٹرویو انگریزی میں تھا، اُن کو دلچسپی سے سننے کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان کے سرکاری موقف کو اُن کے اپنے الفاظ میں اور اصل ذمے دار سے سنا جائے اور اُن کی فکر اور موقف سے آگہی حاصل کی جائے۔ڈاکٹر اشرف غنی دانشور اور ذی فہم شخص نظر آئے اور انہوں نے اپنے ملک کا موقف مؤثر انداز میں پیش کیا، جس کے چند نکات یہ ہیں: (الف) ہم کسی کی Strategic Depth یعنی تزویراتی گہرائی بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔اس ایک جملے میں پاکستان کے پالیسی سازوں اور انٹیلی جنس اداروں کے لیے بہت بڑا پیغام ہے۔(ب) ہم باہمی احترام اور برابری کی سطح پر تعلق چاہتے ہیں۔(ج) یہ شرط ہمیں قبول نہیں کہ پاکستان سے دوستی کرنی ہے تو ہندوستان یا کسی دوسرے ملک سے قطع تعلق کرلو۔(د) دوطرفہ تعلقات میں ہم دونوں پڑوسی ممالک کا یہ حق بنتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ریاستی اور قومی سلامتی کے مفادات کو زک نہ

پہنچائیں، ایک دوسرے کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کو اپنے اشارۂ ابرو کے مطابق چلانے کی خواہش عبث ہے۔ (ہ) اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے دشمن کو ہمارے ہاں پناہ نہ ملے تو ہمارے دشمن کے لیے بھی آپ کا ملک پناہ گاہ نہیں بننا چاہیے۔ (و) میرے نزدیک اُن کے لیے سب سے مشکل سوال ملا فضل اللہ کو پناہ دینے کا تھا، اُس کے جواب میں انہوں نے کہا: ہم پناہ نہیں دے رہے، ہم نے اُسے نشانہ بنانے کی ایک سے زائد بار کوشش کی ہے، ہمارے ہاں لوگوں کا خیال ہے کہ فضل اللہ کی سات زندگیاں ہیں، اس دعوے کی تصدیق یا تکذیب ہمارے ریاستی اور سلامتی کے ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ (ز) اگر کسی کا خیال ہے کہ دنیا یعنی امریکا اور مغرب ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے، تو یہ اُس کی بھول ہے اور اگر کسی کا یہ بھی خیال ہے کہ ہماری مسلّح افواج کو کچل کر نیست و نابود کر دیا جائے گا، تو یہ بھی خام خیالی ہے۔

پس ہمارے ریاستی پالیسی ساز اداروں کی ذمے داری ہے کہ اُن کے موقف کو، جیسا کہ وہ ہے، سمجھ کر گہرے غور و خوض کے بعد اُن سے تفصیلی مکالمہ کریں کہ آیا اُن کے اور ہمارے درمیان کوئی نقطۂ اتصال (Point of Common Inerest) ہے، مابہ الاتفاق (Agreed Upon) امور کیا ہیں اور مابہ الاختلاف امور (Issues of diffrence) کیا ہیں؟۔ کیا فریقین مابہ الاختلاف امور کو کچھ وقت کے لیے ایک طرف رکھ کر دونوں ریاستوں کے مشترکہ مفادات پر کچھ پیش رفت کر سکتے ہیں؟۔ آیا تعلقات کی بہتری اور باہمی اعتماد سازی (Confedince building) کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا ہیں، جن میں سے کچھ حقیقت بھی ہو سکتی ہے اور کچھ مفروضات، ہر ایک فریق کی کچھ مجبوریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ ہم صرف اپنے زاویے سے اور اپنی آنکھ سے ہی دیکھیں گے تو صحیح تصویر سامنے نہیں آئے گی تاوقتیکہ ہم دوسرے کے موقف کا صحیح ادراک نہ کریں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصفِ کمال ایک صاحبِ نظر نے یہ بیان کیا تھا: ''ہمارا امیر نہ دھوکا دیتا ہے اور نہ دھوکا کھاتا ہے''۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ چین کے سوا تمام پڑوسی ریاستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں بے اعتمادی ہے، شکوک و شبہات ہیں اور ہندوستان کے ساتھ تو کھلی دشمنی ہے۔

معید یوسف صاحب نے بھی تحفظات کے بغیر کھل کر باتیں کیں اور اُن کا لبِ لُباب یہ ہے: (الف) امریکا کے ساتھ آنے والے دنوں میں سیاسی تعلقات کی بہتری کے آثار نہیں ہیں۔ (ب) دونوں ممالک کے درمیان بے اعتمادی موجود ہے اور اندیشہ ہے کہ اس میں آنے والے دنوں میں اضافہ ہی ہوگا۔ (ج) ریاستوں کے تعلقات اُن کے قومی مفادات پر مبنی ہوتے ہیں، ان کو شخصی دوستی یا دشمنی پر قیاس نہ کیا جائے۔ (د) اگر آپ ریاستوں کے ساتھ دوطرفہ تعلقات یا بین الاقوامی تعلقات اس شرط پر بنائیں گے کہ ہم سے دوستی کرنی ہے تو ہندوستان سے دشمنی کرنی ہوگی، اس میں آپ کو ناکامی ملے گی۔ (ہ) چین اور امریکا کے درمیان بھی بے اعتمادی موجود ہے اور اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ امریکا سے دوستی کی خاطر آپ کو چین کی دشمنی مول لینا ضروری ہے۔ (و) امریکا اپنے دشمنوں کے ساتھ اپنی سرحدوں سے ہزاروں میل دور نمٹنا چاہتا ہے، وہ جنگ کو اپنی سرحدوں کے قریب آنے کی اجازت نہیں دے گا اور اُس میں یہ صلاحیت اور استعداد موجود ہے۔ (ز) انہوں نے اعتراف کیا کہ امریکا اور مغرب میں اسلاموفوبیا بہر حال موجود ہے اور ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ اپنے حلقے سے باہر امریکیوں سے کن موضوعات پر بات کی جائے، کس حد تک کی جائے اور کن موضوعات پر لب کشائی سے گریز کیا جائے۔ (ح) دوسرے ممالک کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے

Part-3

ہاں قوتِ فیصلہ کس کے پاس ہے اور کس سے بات کی جائے۔ عام طور پر دو طرفہ اور بین الاقوامی معاملات سیاسی سطح پر طے کیے جاتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں امریکا کے انٹیلی جنس اور دفاعی اداروں کے سربراہان اور ذمے داران ہمارے ملک میں اپنے ہم منصب فریق سے آکر بات کرتے ہیں، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ فیصلہ سازی کا اختیار انہی اداروں کے پاس ہے اور اگر سیاسی حکمران کوئی عہد و پیمان کر بھی لیں تو تنفیذ کا حتمی اختیار پھر انہی اداروں کے پاس ہے۔ اس لیے ہماری پارلیمنٹ جو دستوری اعتبار سے آزاد اور مختار ہے، حقیقت کی دنیا میں بے اختیار نظر آتی ہے۔ (و) انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ نیوکلیر سپلائر گروپ میں ہندوستان کی شمولیت کا راستہ آپ چین کی مدد سے ہمیشہ کے لیے بند نہیں کر سکتے۔ ان اداروں میں فیصلے یقیناً مکمل اتفاقِ رائے سے ہوتے ہیں، لیکن چین کی بھی عالمی سطح پر بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں اور ایک مرحلہ ایسا آ سکتا ہے کہ اُسے اِس ادارے کے دیگر رُکن ممالک کے ساتھ اتفاق کرنا پڑے گا اور بھارت یک طرفہ طور پر اس ادارے کی رُکنیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لٰہذا پاکستان کے مفاد میں یہ ہے کہ اس مسئلے میں بھارت کے ساتھ اتفاقِ رائے کی کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ دونوں بہ یک وقت ممبر بن جائیں۔

بین الاقوامی مکالمے کے ماہرین یہ کہتے ہیں: ''There is always a gray area between the red and green area''، سو پالیسی سازوں میں یہ مہارت ہونی چاہیے کہ ریڈ ایریا اور گرین ایریا کے درمیان کوئی گرے ایریا تلاش کریں، یعنی متفقہ اور اختلافی امور کے درمیان مشترکات تلاش کرنا ہی سفارتی مہارت کا ثبوت ہوتا ہے اور یہ کام جذباتی تقریروں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ صبر و تحمل، حوصلے، بصیرت، جرأتِ اظہار اور زیرِ بحث امور میں مہارتِ کاملہ سے حاصل ہوتا ہے۔

کوئٹہ کے سانحے نے ایک بار پھر ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے، بلاشبہ یہ سانحہ ہمارے وطنِ عزیز کے بڑے بڑے سانحات میں سے ایک ہے اور اس سے عیاں ہو چکا ہے کہ دہشت گردی کی بالائی سطح پر کسی حد تک سرکوبی ہوئی ہے، اُس کی شاخوں کو کاٹا گیا ہے، اُن کے بعض مراکز کو تباہ کر دیا گیا ہے، لیکن دہشت گردی کو جڑ سے اکھیڑا نہیں جا سکا، پس اس طرح کے سانحات کے امکانات کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا، دعا ہے کہ ہمارے خدشات غلط ثابت ہوں اور ملک کو دہشت گردی سے مکمل تحفظ نصیب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کی سیاست میں دخیل بعض سیاستدان جذبات پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار پھٹ پڑے۔ ہمارے بزعمِ خویش علم السیاست کے فلسفی جنابِ شیخ رشید احمد، کچھ اینکر پرسنز اور تجزیہ نگاروں نے بعض رہنماؤں پر غداری، وطن دشمنی اور را کے ایجنٹ ہونے کے فتوے لگائے، مذہبی فتووں پر تو سب چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں، لیکن سیاسی فتوے بازی کی ہر ایک کو کھلی اجازت ہے۔ یقیناً ان رہنماؤں کو چاہیے تھا کہ اس نازک وقت میں اپنے جذبات و احساسات کو قابو میں رکھتے تاکہ قومی اتفاقِ رائے کا ایک تاثر دنیا کے سامنے جاتا۔ چنانچہ قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف جناب سید خورشید شاہ نے بھی جذباتی انداز میں کہا کہ ہم سے جو کچھ کہا گیا ہم نے مانا: نیشنل ایکشن پلان تسلیم کیا، فوجی عدالتوں کو تسلیم کیا، نیکٹا کو تسلیم کیا، بعض سلامتی کے اداروں کے اختیارات میں غیر معمولی اضافے کو تسلیم کیا، لیکن وزیرِ داخلہ کے خطاب میں کُل کے سوالات کے جوابات نہیں ملے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حزبِ اختلاف بھی منقسم ہے، شیخ صاحب جن باتوں کو غداری قرار دے رہے ہیں، قائدِ حزبِ اختلاف اُن سوالات کو اپناتے ہوئے اُن کا جواب مانگ رہے ہیں اور ایم کیو ایم نے بھی یہی بات کہی ہے۔

(روزنامہ دنیا، 13 اگست 2016ء)